© rasailojaraid.com



قسط:۳

# ورق ورق زندگی

پروفیسر خالد شبیر احمد

## میرا بچپن

بچپن کے کچھ حالات و واقعات گزشتہ قسطوں میں دادا جان اور والد محترم کے عنوانات کے تحت آ چکے ہیں اور آئندہ بھی وقت کی ترتیب کے ساتھ آتے رہیں گے تاہم بچپن کا عنوان الگ بھی میرے خیال میں ضروری ہے۔ لہٰذا اس عنوان کے تحت بھی اپنی زندگی کے کچھ واقعات پیش نظر ہیں۔

میں جب آج اپنے بچپن کی طرف دیکھتا ہوں تو جو چیزیں اُبھر کر میرے سامنے آتی ہیں اُن میں جسمانی صحت و تربیت، ذہنی تربیت، محبت و جرأت کے ساتھ ساتھ ''احراریت'' کا عنصر میرے بچپن کو محیط کئے نظر آتا ہے۔ اور ان تمام عناصر میں سب سے زیادہ اور سب سے بڑا عنصر اگر چننا پڑے تو یہ عنصر ''احراریت'' ہی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں فطرتاً احراری ہوں تو اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ کیونکہ بچپن کے بعد جیسے جیسے میں شعوری طور پر بیدار ہوتا گیا ویسے ویسے میرا ''جذبۂ احراریت'' بھی جوان ہوتا گیا اور آج میں اپنی عمر کے ستتر ویں (۷۷) برس میں داخل ہو کر بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن میرا یہ جذبۂ احراریت اب بھی اپنے پورے جوبن پر ہے۔ جس پر مجھے فخر ہے اور میں اللہ تعالیٰ کا اس پر شکر ادا کرتا ہوں جس نے میرے دامنِ زندگی کو مجلس احرار اسلام کے ساتھ اس پختگی کے ساتھ باندھ دیا ہے کہ اب اس کا چھٹنا میرے اپنے بس میں بھی نہیں ہے اور نہ میں خود ایسا چاہتا ہوں، بعض لوگوں کو نہ جانے کیوں میرے احراری ہونے پر تعجب ہوتا ہے۔ وہ حیران ہو کر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ''تو بھی احراری ہے'' تو میرا جواب یہی ہوتا ہے کہ ''میں ہی احراری ہوں''

میرا بچپن بھی میرے والدِ محترم کی زندگی کی طرح ایک جگہ نہیں گزرا۔ چنیوٹ میں آنکھ کھولی، لاہور میں پہلی دفعہ زمین پر قدم رکھ کر چلنا شروع کیا۔ لائل پور (فیصل آباد) میں تعلیم شروع کی۔ تیسری جماعت میں چنیوٹ آ گئے، چھٹی جماعت تک اسلامیہ ہائی سکول چنیوٹ میں ہی پڑھتے رہے۔ چھٹی جماعت کا امتحان دہلی کے فتح پوری مسلم ہائی سکول سے پاس کیا۔ ساتویں جماعت تک دہلی میں ہی پڑھتا رہا۔ جس کے بعد پھر چنیوٹ، لائل پور کے مسلم ہائی سکول طارق آباد سے ۱۹۵۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۲ء میں گورنمنٹ کالج اور پھر زرعی کالج (اس وقت یونیورسٹی کا درجہ اسے حاصل نہ ہوا تھا) میں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۳ء میں کالج چھوڑ کر تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جس کے بعد ۱۹۵۳ء میں پھر گورنمنٹ کالج میں دوبارہ فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا۔ اسی کالج سے ۱۹۵۷ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا، پھر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے کر پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۹ء میں ایم۔اے سیاسیات کی ڈگری حاصل کی۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میرا بچپن چنیوٹ، لاہور، فیصل آباد اور دہلی جیسے اہم شہروں کی تہذیبوں کے درمیان گزرا۔ سوائے لائل پور (فیصل آباد) باقی دوسرے شہر جہاں تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، وہیں تہذیب و تمدن، ثقافت سیاسی مراکز کے اعتبار سے بھی ایک ممتاز منفرد مقام رکھتے ہیں۔ میری ذہنی تربیت میں ان سب شہروں کی طرزِ بود و باش، اندازِ فکر، سیاسی و سماجی سرگرمیوں کا ایک مخصوص کردار ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جماعتِ احرار کی طرح ان شہروں نے بھی میری فکری تربیت میں اچھا خاصا کردار ادا کیا ہے تو یہ بات بھی درست ہے۔

## لائل پور (دھوبی گھاٹ)

لائل پور (فیصل آباد) اُس وقت خود اپنے بچپن سے گزر رہا تھا۔ جب ہم لوگ لائل پور کے محلے دھوبی گھاٹ میں ’’قیصر شاہ‘‘ کے مکانوں میں سے ایک مکان میں مقیم تھے۔

لائل پور ۹۸۔۱۸۹۷ء میں معرضِ وجود میں آیا۔ جب پنجاب کے گورنر ’’سر جیمس لائیل‘‘ تھے۔ اُنہی کے نام سے ہی لائل پور کہلایا۔ اُنہوں نے باقاعدہ شہر کا نقشہ بنوایا جس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نقشہ برطانوی جھنڈے یونین جیک کو پیشِ نظر رکھ کے بنایا گیا ہے۔ ’’ساندل بار‘‘ کا یہ علاقہ شہر کی تعمیر کے بعد کس طرح اور کیسے کیسے اب پاکستان کا تیسرا بڑا شہر بن گیا ہے، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ مجھے تو لائل پور کے بچپن (بچپن اس لیے کہ جب ہم لائل پور میں تھے تو اُس وقت لائل پور کی تعمیر کو صرف انتالیس چالیس برس ہی گزرے تھے تو شہر کی زندگی میں اتنا عرصہ اُس کا بچپن ہی کہلاتا ہے) سے سروکار ہے۔

اس وقت لائل پور شہر مختصر آبادی کا صاف ستھرا اور ہر لحاظ سے دلکش شہر ہوتا تھا۔ شہر کی آبادی صرف گھنٹہ گھر اور اُس کے اردگرد تک ہی محدود تھی۔ ان کے علاوہ جو محلے گھنٹہ گھر سے ذرا دور تھے۔ اُن میں بہترین محلّہ دھوبی گھاٹ ہی تھا۔ اس کے ساتھ ہی محلّہ گورونانک پورہ اور پھر اُس کے قریب محلّہ محمد پورہ اور پھر محلّہ محمد پورہ سے بہت دور اس وقت کے حساب سے اُسے دور ہی کہنا چاہیے محلّہ مدن پورہ تھا۔ یہاں کوئی بہ امرِ مجبوری ہی جاتا تھا۔ اس لیے بھی کہ ذرائع آمد و رفت کی صورت اس وقت ایسی نہ تھی جیسی کہ آج ہے۔ ادھر لائل پور کے شمال مشرقی کونے میں چند محلے اس وقت بھی تھے جن میں سب سے زیادہ مشہور محلّہ طارق آباد تھا اور اس سے آگے عبداللہ پور۔

کارخانہ بازار کے باہر شہر کے مشرق میں مال گودام تھا جسے لائل پور کے ریلوے سٹیشن کے ساتھ بذریعہ ریلوے لائن ملا دیا گیا تھا۔ جہاں سے مختلف قسم کا بھاری مال بیرون شہر بذریعہ ریل جاتا اور آتا تھا۔ مال گودام سے آگے دوسری جانب محلّہ فیکٹری ایریا شروع ہو جاتا تھا۔ اسی محلّہ کے شروع میں کالونی فلور ملز (لال مل) تھی جہاں سے ایک سڑک ’’لائل پور کاٹن ملز‘‘ کو جاتی تھی۔ کاٹن ملز کو جانے والی سڑک کے دونوں طرف کاٹن فیکٹریاں تھیں اور شاید انہی کاٹن فیکٹریوں کی وجہ سے یہ علاقہ فیکٹری ایریا کہلاتا تھا۔ انہی فیکٹریوں کے عقب میں چند اور فلور ملز بھی تھیں۔ جن میں گنیش فلور ملز کافی مشہور مل تھی۔ بس یہاں لائل پور ختم ہو جاتا تھا۔ یہی اس وقت کا لائل پور تھا۔ جس کی وجۂ شہرت نیا شہر ہونے کے علاوہ اس کا صاف ستھرا ہونا اور اس کا خوبصورت باغ کمپنی باغ تھا جو آج بھی شہر بھر کی توجہ کا مرکز ہے اور جہاں صبح کی سیر سے لوگ آج بھی بڑی تعداد میں محظوظ ہوتے ہیں۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



دھوبی گھاٹ کے سامنے ایک وسیع وعریض گراؤنڈ تھا جو قیام پاکستان سے پہلے ''دوسہرا گراؤنڈ'' کہلاتا تھا۔ اس لیے کہ اس گراؤنڈ (پارک) میں ہندوؤں کا مشہور تہوار دوسہرا جس میں راون اور چند دوسرے اس طرح کے تاریخی کرداروں کے پتلے جلائے جاتے تھے۔ شہر کا یہ سب سے بڑا اور مشہور ومعروف تہوار ہوتا تھا۔ ان پتلوں کی تیاری پر تقریباً ایک مہینہ صرف ہو جاتا تھا۔ راون کا پتلا سب سے اہم اور سب سے بڑا ہوتا تھا۔ جو گڈی کاغذ اور بانس کی مدد سے تیار ہوتا تقریباً بیس پچیس فٹ بلند پُتلا جس میں مختلف قسم کی آتش بازی فٹ کر دی جاتی۔ دوسہرے والے دن ہندو ہزاروں کی تعداد میں اس وسیع گراؤنڈ میں اکٹھے ہوتے اور ان پتلوں کو آگ لگا دی جاتی۔ جن میں سے آتش بازی کی آوازیں بلند ہو کر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتی اور لوگ اس سے لُطف اندوز ہوتے۔ ان پتلوں کے اردگرد ہندو جلوس کی صورت باجوں تاشوں کے ساتھ گھومتے اور گتکا کھیلتے ہوئے گزرتے تو ایک عجب سماں بندھ جاتا۔ بھجن گاتے ہوئے ہندو اپنے بھجن سے اردگرد کے ہندوؤں پر ایک عجیب وغریب کیفیت پیدا کر دیتے تھے۔ ہندوؤں کے علاوہ شہر کے مسلمان بھی اس تہوار کو بڑے شوق سے دیکھتے۔

دوسہرہ گراؤنڈ کے ساتھ ہی جو آج کل عید باغ کہلاتا ہے گورنمنٹ کالج کی عمارت ہے۔ جو میرے بچپن میں شہر کا واحد تعلیمی ادارہ تھا جو حکومت کی تحویل میں تھا۔ اس کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلیمی ادارے بھی تھے۔ سکھوں کا خالصہ کالج بھی کافی مشہور تعلیمی ادارہ تھا۔

گورنمنٹ کالج میرے گھر کے بالکل قریب تھا۔ میں کبھی کبھی کالج میں کھیلنے کے لیے چلا جاتا تھا۔ چند ہم عمر لڑکے بھی میرے ساتھ ہوتے۔ وسیع وعریض سرسبز گراؤنڈ ایک جگہ پر ایک خوشنما باغ جس میں رنگ برنگ خوشنما پھول دیکھ کر ایک عجیب قسم کی مسرت وراحت میسر آتی تھی۔ میں جب کالج میں اس سیر سے لطف اندوز ہو کر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا تو جی میں آتا کہ کبھی تو میں بھی اس تعلیمی ادارے میں داخل ہو کر پڑھوں گا اور تعلیم حاصل کر کے بڑا آدمی بنوں گا۔ بچپن کی خواہش اس طرح پوری ہوگئی کہ میں نے اسی کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور اسی کالج میں تقریباً بیس برس تک پڑھاتا رہا۔ اور اسی کالج سے اپریل ۱۹۹۴ء میں ریٹائر ہوا۔

میرے بچپن میں دھوبی گھاٹ کا یہ محلّہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کہ یہیں سے مجھے ہاکی کھیلنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ اس طرح کہ دھوبی گھاٹ محلے کی اپنی ہاکی ٹیم ہوتی تھی۔ جو شہر کے بڑے بڑے ٹورنامنٹ جیت کر آتی تو پورا محلّہ ان کا استقبال کرنے کے لیے گھروں سے باہر آجاتا تھا۔ استقبال کرنے والوں میں محلے کے بچے بھی ہوتے جن میں مَیں بھی ہوتا۔ استقبال کرنے والے ایک جلوس کی صورت اختیار کر لیتے۔ جلوس کے آگے آگے بینڈ باجے ہوتے اور ہاکی کے کھلاڑیوں کو پھولوں سے لاد دیا جاتا۔ میں یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ دل میں ایک امنگ سی ابھرتی کہ کبھی تو میں بھی ہاکی کا ایک اچھا کھلاڑی بنوں گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہاکی کے میدان میں میرے کارنامے اس آغاز کا نقطۂ عروج ہیں تو غلط بات نہیں۔ دھوبی گھاٹ کی ہاکی ٹیم کو دیکھ کر ہی میں نے والد صاحب سے ہاکی کی فرمائش کر دی اور انہوں نے میری یہ فرمائش دوسرے دن ہی پوری کر دی۔ ہاکی تو آ گئی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کھیلوں گا کن کے ساتھ۔ اسی محلّہ کے ہاکی کھلاڑی پچھلے پہر اُسی دوسہرا گراؤنڈ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، میں ہاکی کھیلتے



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



۔وہ سب مجھے جانتے تھے اور اباجی کی وجہ سے مجھے پیار بھی کرتے۔ جب میں پہلی دفعہ ان کے پاس ہاکی لے کر آیا اور انہیں کہا کہ مجھے بھی ہاکی کھیلنے کا موقعہ دو تو انہوں نے مجھے کہا کہ ادھر آؤ اور ہاکی کا بال ہم سے چھینو، جب میں بھاگ کر ایک کھلاڑی کے پاس جاتا تو وہ کھلاڑی بال کو دوسرے کھلاڑی کے پاس پھینک دیتا اور دوسرا تیسرے کھلاڑی کے پاس اور اس طرح میں ان کھلاڑیوں کے درمیان فقط بھاگتا ہی رہتا۔ جب وہ محسوس کرتے کہ میں تھک گیا ہوں تو پھر از راہ کرم وہ بال مجھے دے دیتے اور کہتے کہ واہ بھائی شبیر نے تو ہم سے بال چھین لیا ہے اور اس طرح میں خوش ہو جاتا۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کھلاڑی آپس میں ''ہارڈ ہٹنگ'' کر رہے تھے اور میں درمیان آ گیا، بال میری پنڈلی کے گوشت پر لگا اور میں قدرے بے ہوشی کے عالم میں چلا گیا۔ انہیں تشویش ہوئی میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے اور میری پنڈلی کی مالش کی گئی تو مجھے ہوش آ گیا۔ کھلاڑیوں نے مجھے کہا کہ اب بھی ہاکی کھیلے گا؟ میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا کہ ہاں ضرور کھیلوں گا۔ پھر ایسا ہوا کہ میں نے والد صاحب سے ہاکی بال کی بھی فرمائش کر دی۔ جب بال آ گیا تو پھر میں اکیلا ہی گراؤنڈ میں کھیلتا رہتا۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ شام ہو گئی اور میں بال کے ساتھ ہاکی کھیلتا رہا کہ ایک آدمی نے مجھ سے ہاکی چھین لی میں روتا ہوا اس کے گھر تک اس کے پیچھے گیا۔ لیکن اس نے میری ہاکی مجھے واپس نہ کی۔ روتا ہوا گھر آیا تو اباجی نے کہا کہ اچھا کوئی بات نہیں کل نئی ہاکی آجائے گی۔

پھر دوسرا مرحلہ یہ آیا کہ میں اپنے محلے کی ہاکی ٹیم کے ساتھ وہاں چلا جاتا جہاں انہوں نے میچ کھیلنا ہوتا۔ گراؤنڈ کے باہر بیٹھ جاتا اور ان کا میچ دیکھتا۔ میچ کے دوران میری ڈیوٹی یہ ہوتی کہ بال جب گراؤنڈ سے باہر چلی جاتی تو میں بھاگ کر بال پکڑتا اور گراؤنڈ میں پھینک دیتا۔ کبھی کبھی میری جیب میں چند پیسے ہوتے تو میں اپنے محلے کی ہاکی ٹیم کی جیت پر کچھ میٹھی چیز خرید کر ٹیم کے کپتان کو دے دیتا۔ اس شوق سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ میں پورے محلے میں متعارف ہو گیا۔ ماسٹر نذیر مجیدی کا بیٹا شبیر سب مجھے جاننے لگ گئے۔

میرے سب سے چھوٹے چچا منیر احمد ہمارے ساتھ ہی مقیم تھے انہوں نے ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ جیسے ہی گلی میں میری عمر کے کسی لڑکے کو دیکھتے مجھے کہتے کہ اس سے لڑے گا میں سینہ تان کر کہتا کہ ہاں لڑوں گا۔ پھر کہتے کہ اچھا جاؤ اس سے لڑو۔ پھر کیا ہوتا کہ میں فوراً ان کے حکم کی تعمیل کرتا اور لڑکے کے ساتھ لڑنا شروع کر دیتا۔ کبھی مارتا کبھی کسی سے مار کھاتا اس کے باوجود لڑکوں سے لڑنا میرا ایک مشغلہ ہو گیا۔ اس طرح لڑنے کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ مجھ میں اعتماد پیدا ہو گیا کہ میں اپنے مدمقابل سے لڑ سکتا ہوں۔ ایک دفعہ محلے کے ایک سکھ لڑکے سے لڑا دیا گیا تو میں نے اس کی خوب خبر لی۔ وہ قد وقامت اور ڈیل ڈول میں مجھ سے کافی بڑا تھا۔ میں نے اسے اس قدر مارا کہ وہ رونے لگ گیا۔ آنے جانے والے اکٹھے ہو گئے اور اس سے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ اس نے (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) مجھے مارا ہے۔ لوگ کہتے تو غلط کہتا ہے یہ تجھے کیسے پیٹ سکتا ہے؟ وہ اور زیادہ زور سے رونا شروع کر دیتا کہ ایک مجھے مار پڑی ہے دوسرے لوگ میری بات مانتے نہیں ہیں۔ بہر حال بچپن کی یہ مار دھاڑ بعد میں میرے بڑی کام آئی۔

گھر میں ہم تین بہن بھائی (شبیر، صغیر اور اقبال بہن) اپنے والدین اور چچا جان کے ساتھ رہتے تھے۔ گھر میں



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



مَیں ان میں سے بڑا تھا اس لیے والدہ مرحومہ مجھے ہی باہر سودا لینے کے لیے بھیجا کرتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ’’دونی‘‘ دو آنے میں ایک سیر دودھ محلے کی ایک دکان جو چودھریوں کی دکان کہلاتی تھی سے لے آتا تھا۔ یعنی اس وقت ایک روپے کا آٹھ سیر دودھ آتا تھا۔ ایک روپے کا بارہ چھٹانک دیسی گھی اور ایک روپے کی ڈھائی من جلانے والی لکڑی اُس وقت مل جاتی تھی۔ حالانکہ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔

## ضمنی انتخاب

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ لائل پور (فیصل آباد) کے حلقے میں ایک ضمنی انتخاب تھا۔ جس میں مسلم لیگ کی طرف سے چنیوٹ کے شیخ امین بیرسٹر اور مجلس احرار اسلام کی طرف سے میر عبدالقیوم ایڈووکیٹ امیدوار تھے۔ میر عبدالقیوم حکیم نور الدین مرحوم لائل پوری کے بیٹے تھے جو مجلس احرار اسلام کے بانی اراکین میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمارا محلّہ میر عبدالقیوم ایڈووکیٹ کے ساتھ تھا۔ جب کبھی میر صاحب کے حمایتوں کا جلوس دھوبی گھاٹ سے گزرتا تو پورا محلّہ گھروں سے نکل کر اس جلوس میں شریک ہو جاتا۔ احرار اسلام زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی تھی۔ ان نعروں میں میری آواز بھی شامل ہوتی حالانکہ میں اس وقت مجلس احرار کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جو کچھ میری آنے والی زندگی کا ایک اہم حصہ بننے والا تھا اس کا آغاز میرے بچپن سے ہی ہو گیا تھا۔ مثلاً ہاکی کھیلنے کا شوق، اور یہ مجلس احرار اسلام زندہ باد کے نعرے میری آنے والی زندگی کا لازمہ بن گئے کہ اب ان کے بغیر زندگی کی کہانی ایک ادھوری کہانی ہے۔

دھوبی گھاٹ میں ایک مکان غلام نبی بھٹی ٹھیکیدار کا بھی تھا۔ جس پر ہر وقت مجلس احرار اسلام کا پرچم لہراتا رہتا اس کے بیٹے اسلم بھٹی، انور بھٹی دھوبی گھاٹ ہاکی ٹیم کے کھلاڑی تھے اور یہی وجہ تھی کہ میرا ان کے گھر آنا جانا تھا۔ غرضیکہ ہم دھوبی گھاٹ میں ایک اچھی اور ہر لحاظ سے خوش کن زندگی بسر کر رہے تھے کہ اچانک لائل پور چھوڑ کر چنیوٹ آ گئے۔

## چنیوٹ واپسی کی وجہ

چنیوٹ واپسی کی وجہ یہ تھی کہ انجمن اسلامیہ لائل پور سے انجمن اسلامیہ چنیوٹ نے میرے والد صاحب کی سروس مستعار لے لی تھی۔ شیخ فضل کریم اس وقت انجمن اسلامیہ چنیوٹ کے صدر تھے۔ جب کہ انجمن اسلامیہ لائل پور کے صدر شیخ محبوب الٰہی تھے جو پاکستان بن جانے کے بعد لائل پور سے پنجاب اسمبلی کے رکن بھی بن گئے تھے۔ والد صاحب کہتے تھے کہ ان دونوں کی ملاقات میں ہی یہ فیصلہ ہوا تھا کہ میری سروس عارضی طور پر انجمن اسلامیہ چنیوٹ کی تحویل میں دے دی جائے۔ یہ تقاضہ چنیوٹ کی انجمن اسلامیہ کے صدر شیخ فضل کریم کی طرف سے کیا گیا تھا جن سے والد صاحب کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ اسی ملاقات میں شیخ محبوب الٰہی نے شیخ فضل کریم سے یہ بھی کہا تھا کہ ’’تم اس قیمتی آدمی کو مجھ سے لے جا تو رہے ہو لیکن تم اسے وہاں پر خراب کرو گے یہ یہاں لائل پور رہتا تو میرے لیے بھی اور اس کے لیے بھی بہتر ہوتا۔‘‘

## ڈاکٹر عزیز علی سے دوستی

چنیوٹ میں قیام کے دوران والد صاحب نے ’’یادِ خدا‘‘ میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر عزیز علی مرحوم کے



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



دادا جان کے ساتھ خصوصی تعلقات تھے۔ ڈاکٹر عزیز علی ہندو دھرم ترک کر کے پنڈی بھٹیاں (جوان کا آبائی وطن تھا) سے رجوعہ سادات آئے۔ کچھ عرصہ رجوعہ میں سردار غلام عباس کے ہاں قیام کیا جو اس وقت آل انڈیا لیجسلیٹو کونسل کے رکن تھے بعد میں چنیوٹ آ گئے۔ یہیں پر انہوں نے دوسری شادی شیخ خاندان کے ہاں کی۔ پہلی بیوی نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اس ہندو بیوی سے ایک بچی اپنے والد کے ساتھ ہی مسلمان ہو گئی تھی۔ چنیوٹ میں ڈاکٹر عزیز علی کا تعلق دادا جان سے ہو گیا۔ انہوں نے ڈاکٹر عزیز علی کو اپنے بیٹوں کی طرح چاہا اور دادا جان کی سرپرستی میں ڈاکٹر عزیز علی نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ ''المنیر'' کے بعد ''یادِ خدا'' دوسرا اہم مجلّہ تھا جو چنیوٹ کی صحافتی تاریخ کا زریں باب بنا جس کے ذریعے نہ صرف چنیوٹ بلکہ گرد و نواح کے مسلمانوں میں ملی شعور، سیاسی سوجھ بوجھ، دینی سوچ پیدا ہوئی بلکہ چنیوٹ کے مسلمانوں کو ایک منظّم جماعت میں تبدیل کرنے میں بھی اس اخبار نے ایک اہم کردار ادا کیا۔

## دوستی کا سبب

والد صاحب اور ڈاکٹر عزیز علی کے درمیان بے مثال دوستی کا اوّلین سبب تو میرے دادا جان ہی تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ دوستی مضبوط سے مظبوط تر ہوتی چلی گئی۔ ہر مشکل وقت میں دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب انجمن اسلامیہ چنیوٹ اور ڈاکٹر عزیز علی کے درمیان کسی بات پر ٹھن گئی تو انجمن اسلامیہ نے والد صاحب سے کہا کہ یا عزیز علی کی دوستی چھوڑ دو یا پھر نوکری تو والد صاحب نے انجمن سے کہا کہ میں نوکری تو چھوڑ سکتا ہوں مگر عزیز علی کی دوستی نہیں چھوڑ سکتا۔ آج بھی ان دونوں کی دوستی کا اثر اس شکل میں موجود ہے کہ ڈاکٹر عزیز علی کے بڑے بیٹے ڈاکٹر سرفراز میرے بہترین دوست ہیں۔ ہم بچپن میں اکٹھے کھیلے اور آج عمر کے اس آخری حصے میں بھی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اِس دوستی میں خلوص کی مہک بھی ہے اور ہمدردی کی خوشبو بھی۔

دوسری اہم بات جو والد صاحب اور ڈاکٹر عزیز علی کے درمیان قدرِ مشترک تھی اور جو ان کی دوستی کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوئی یہ تھی کہ دونوں قادیانیوں کے شدید مخالف تھے۔ ڈاکٹر عزیز علی نے تو تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں جھنگ اور لاہور جیل میں بڑی بہادری کے ساتھ ایک سال قید کاٹی۔ لاہور جیل میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی کچھ دن رہے۔ جھنگ جیل میں مولانا عزیز الحسن خطیب جامع مسجد شہید روڈ جھنگ ان کے جیل کے ساتھی تھے۔ جو ڈاکٹر عزیز علی کی بہادری کے والہ و شیدا تھے۔

تیسری وجہ جو دوستی کے استحکام کا باعث بنی وہ ڈاکٹر عزیز کی (شہر کے لیے) رفاہی اور اصلاحی خدمات اور ان کے جذبۂ صادق کا جنون کی حد تک پہنچ جانا تھا۔ میرے والد مرحوم اور ملک اللہ دتہ صدر مجلس احرار اسلام چنیوٹ ان رفاہی کاموں میں ڈاکٹر عزیز علی کے شانہ بشانہ کام کرتے نظر آتے۔

## چنیوٹ میں پہلی دفعہ مفادِ عامہ کمیٹی کا قیام (۱۹۴۳ء)

۱۸/ جنوری ۱۹۴۳ء کو چنیوٹ کے مسلمانوں نے شاہی مسجد میں جمع ہو کر مفادِ عامہ کمیٹی تشکیل دی۔ اتفاق رائے



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



سے جس کی صدارت ڈاکٹر عزیز علی کو سونپی گئی۔ نو (۹) اراکین پر مشتمل مجلس عاملہ بنائی گئی جس میں چنیوٹ کی مختلف سیاسی اور سماجی تنظیموں کے درج ذیل اراکین شامل تھے۔

حاجی مبارک دین، نائب صدر (ٹرسٹی بورڈ زنانہ ہسپتال چنیوٹ)

محمد گلزار ولد میاں مولا بخش وسیر، سیکرٹری جنرل (رکن مجلسِ احرارِ اسلام)

حاجی غلام محی الدین، خزانچی (صدر مسلم لیگ چنیوٹ)

**اراکین:**

حاجی مولا بخش ودھاون (نشاط ملز والے) ڈاکٹر محمد اسماعیل، خاکسار تحریک

میاں خدا بخش، صدر انجمن اصلاح المسلمین ملک اللہ دتہ، صدر مجلس احرار اسلام چنیوٹ

اس ادارے نے شہر کے مسائل کو حل کرنے کے لیے انتھک محنت اور خلوص کے ساتھ کام کیا۔ جس کی وجہ سے ڈاکٹر عزیز علی پورے شہر اور گردونواح میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ ایک خاص بات یہ بھی تھی چنیوٹ کے ہندو ڈاکٹر عزیز علی کے سخت مخالفین میں سے تھے۔ اس لیے بھی کہ ڈاکٹر عزیز علی کی یہ خدمات ہندوؤں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح چبھتی تھیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ رفاہی اور مفاد عامہ کے کاموں میں ان کی یہ سرگرمی چنیوٹ کے مسلمانوں کو ایک منظّم تنظیم میں تبدیل کر رہی ہے۔ یہ مخالفت اس نہج تک پہنچی کہ ہندوؤں نے ڈاکٹر عزیز علی کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ دائر کر دیا۔ جس میں ڈاکٹر عزیز علی کو ایک سال کی سزا دی گئی لیکن آٹھ ماہ بعد دوسری عدالت نے انھیں مقدمے سے باعزت بری کر دیا گیا۔ ڈاکٹر عزیز علی کی ذہانت اور قادیانیوں کے خلاف نفرت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے قادیانیوں کو مسلم حلقہ نیابت پنجاب اسمبلی کے رائے دہندگان کی فہرست سے خارج کر کے ان کے لیے علیحدہ غیر مسلم حلقۂ نیابت بنانے کی تحریک ۱۹۵۰ء میں شروع کی۔ اس کے لیے ایک خاص قسم کے فارم چھپوائے گئے۔ ان فارموں پر شہر کے مسلمانوں سے دستخط کروانے کی مہم شروع کی گئی۔ یہ فارم حکومت پنجاب کو ہزاروں کی تعداد میں بھجوائے گئے تاکہ قادیانیوں کے نام مسلمانوں کے ووٹروں کی فہرست سے الگ کیے جائیں۔ کیونکہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں ڈاکٹر عزیز علی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور ایک دن اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ انہیں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے ایک سال کے لیے جھنگ جیل بھیج دیا گیا۔ جیل میں انہیں بی کلاس دی گئی ان کے علاوہ جنہیں بی کلاس ملی ان میں خاص طور پر مندرجہ ذیل شخصیات قابل ذکر ہیں۔

۱۔ مولانا محمد ذاکر مرحوم و مغفور، محمدی شریف

۲۔ ملک اللہ دتہ صدر مجلس احرار اسلام چنیوٹ

۳۔ مولانا عزیز الحسن خطیب جامع مسجد شہید جھنگ روڈ

جھنگ جیل سے بعد میں ان حضرات کو سنٹرل جیل لاہور منتقل کیا گیا۔ جہاں دیوان احاطے میں بھی ڈاکٹر عزیز



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



علی، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا محمد ذاکر اور مولانا غلام محمد ترنم کے ساتھ رہے۔ ڈاکٹر سرفراز بتاتے ہیں کہ ان کی بڑی بہن ان دنوں لاہور میں مقیم تھی جنہوں نے میرے والد صاحب کو ایک خاص قسم کا اچار جیل بھیجا جسے امیر شریعت کو پیش کیا گیا اور انہوں نے بہت پسند کیا۔

یہ تھی والد محترم کی ڈاکٹر عزیز علی کے ساتھ گہری دوستی کی وجوہات۔ ''یادِ خدا'' کی مجلس ادارت میں ان کی شمولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے دوست تھے۔ جب اباجی لائل پور میں تھے اس وقت بھی وہ ''یادِ خدا'' کے لیے کچھ نہ کچھ لکھ کر بھجوا دیتے تھے۔ ان کے لیے یادِ خدا میں ایک خاص کالم مخصوص تھا جس کا عنوان ''تلخ و شیریں'' تھا۔ چنیوٹ آ کر والد صاحب نے یادِ خدا کے لیے مستقل طور پر لکھنا شروع کر دیا۔ چند کالم اگلی قسط میں نذرِ قارئین کئے جائیں گے۔

(جاری ہے)

© rasailojaraid.com